علومِ عقلیہ میں علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی بصیرت

از ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، شعبۂ عربی امر سنگھ کالج سری نگر (کشمیر)

علوم عقلیہ میں علامہ انور شاہ کی بصیرت علامہ انور شاہ کشمیری نقلی علوم میں فاضل جلیل تو تھے ہی، مگر بہت کم اہل علم اس بات سے واقف ہیں کہ انھیں عقلی علوم جیسے فلسفہ، منطق اور کلام پر بھی وسیع اور گہری نظر تھی۔ انھوں نے ان علوم پر نہ صرف تقریریں اور بحثیں کی ہیں بلکہ فلسفہ اور کلام کے کچھ اہم مسائل پر دو رسالے لکھے ہیں۔ ان کے عہد میں طبیعیات اور ہیئت پر بہت سی ایسی باتیں منظرِ عام پر آرہی تھیں جنھوں نے قدیم طبیعیاتی اور ریاضیاتی تصورات میں بڑا انقلاب رونما کیا، علامہ کشمیری اپنے وفورِ مطالعہ سے ان علمی تحقیقات سے بھی باخبر تھے، پھر انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں معقولات کی کتابیں نہ صرف یہ کہ درس میں باضابطہ پڑھی تھیں بلکہ درس کے علاوہ بھی وہ معقولات کی کتابوں کا بڑی توجہ سے مطالعہ کرتے تھے۔ انھوں نے قاضی مبارک، شرح چغمنی، صدرا، شمس بازغہ، نفیسی وغیرہ کتابیں درس میں پڑھی تھیں۔ یہ کتابیں اس زمانے میں اونچے درجوں کے نصاب میں شامل تھیں۔ دیوبند کی مدرسی اور صدر مدرسی کے زمانے میں اگرچہ وہ استادِ حدیث کی حیثیت سے مشہور ہوئے مگر یہاں بھی وہ فارغ اوقات میں چند خاص شاگردوں کو جدید سائنس کی تعلیم دیتے تھے۔ دیوبند میں آپ کے قیام کے ساتویں سال یعنی [illegible]ھ کے روئداد دارالعلوم میں یہ الفاظ درج ہیں:

"مولانا سات سال سے دارالعلوم میں مقیم ہیں اور طلبہ کو علوم حدیث کا مستقلاً درس دیتے ہیں، اس کے علاوہ دیگر فنون کی ہر قسم کی کتابوں کا وقتاً فوقتاً داخلی اور خارجی اوقات میں درس دیتے رہتے ہیں۔ طلبہ رات دن ہر قسم کے استفادے آپ سے کرتے ہیں"[1]

علامہ کشمیری کے ایک اور سوانح نگار لکھتے ہیں:

"فلسفۂ جدید اور ہیئت جدید کا بھی آپ نے گہرا مطالعہ فرمایا تھا۔ آپ نے بعض مخصوص تلامذہ کو جدید سائنس کی ایک کتاب بھی پڑھائی تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ اب علماء کو قدیم فلسفہ و ہیئت کے ساتھ ساتھ جدید فلسفہ و ہیئت بھی حاصل کرنا چاہیے"[2]

پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی اور زیادہ واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

"اس کا شاید کم لوگوں کو علم ہوگا کہ حضرت الاستاذ موجودہ سائنس یعنی فزیکس، کمسٹری اور بیالوجی کا بھی بڑا وسیع مطالعہ رکھتے تھے اور ان علوم میں بھی ان کی نظر مبقرانہ تھی"[3]

مولانا اکبرآبادی نے ان مخصوص طلبہ میں، جنھیں علامہ کشمیریؒ عقلی علوم کا درس دیتے تھے، حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ کا نام بھی ذکر کیا ہے۔

یہ تو مسلّم ہے کہ علامہ کشمیری انگریزی زبان سے بالکل ناواقف تھے اور علوم عصریہ سے باخبر اور واقف ہونے کے لیے یہ زبان کلیدی حیثیت رکھتی ہے، مگر انگریزی زبان سے عدم واقفیت سائنس اور سائنسی معلومات کے حصول میں علامہ کشمیری کے لیے مانع ثابت نہیں

۱۔ بحوالہ فرنگیوں کا جال: امداد صابری: ص ۱۴۹، صابری پبلشرز دہلی ۱۹۴۹ء

۲۔ بحوالہ: موج کوثر، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام: ص ۲۱۰، فیروز سنز پاکستان ۱۹۶۸ء

۳۔ حیات انور، مولانا ازہر شاہ قیصر: حصہ دوم، ص ۳

ہوئی کیونکہ اس زمانے میں عرب ممالک میں یورپی تصانیف اور تالیفات کا بڑے زور شور سے عربی میں ترجمہ ہو رہا تھا اور یہ عربی مطبوعات ہندوستان بھی پہنچتی تھیں۔ علامہ کشمیری انہی کے توسط سے جدید تحقیقات کا مطالعہ کرتے تھے۔ بالخصوص دو دائرۃ المعارف (بستانی اور فرید وجدی کی) ان کی آنکھوں کے سامنے بالفاظ مولانا بنوری گویا کاغذ کا ایک ورق تھیں:

فھذا کتاب دائرۃ المعارف للوجدی او للبستانی کانما صفحۃ واحدۃ بین عینیہ[1]

فرید وجدی یا پطرس بستانی کی دائرۃ المعارف ان کے دماغ میں اس طرح نقش ہیں گویا یہ ان کی آنکھوں کے سامنے کاغذ کا ایک ورق ہیں۔

ایک مرتبہ علامہ اقبال نے علامہ کشمیری سے پوچھا کہ کیا آپ نے نیوٹن کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے نیوٹن کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور زمان و مکان سے متعلق ان کی تحقیقات وہی ہیں جو آج سے صدیوں پہلے عراقی فلسفی نے اپنے رسالے میں پیش کی ہیں۔ اگرچہ علامہ کشمیری کے فلسفہ پر لکھے ہوئے دو رسالے ان کی علمی بصیرت کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ثبوت ہیں تاہم عصری علوم سے متعلق بہت سی تحقیقات وہ اپنے ساتھ لے گئے اور اس طرح آنے والی نسل کو محروم رکھا۔ ان کے دو رسالوں اور دوسرے منتشر افادات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلسفہ اور کلام میں بھی دوسرے ماہرین فن کی طرح اپنا علیحدہ مقام رکھتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد مدرسۂ اسلامیہ ڈابھیل کا آخری سال یاد دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اللہ اللہ! وہ ڈابھیل کا آخری سال، استاذِ زماں کی پڑھائی، معقولات کے فاضل طلبہ وہاں پہنچے اور ہر ایک اپنے آپ کو ابن سینا سمجھتا تھا۔

---

[1] عقیدۃ الاسلام، علامہ محمد انور شاہ کشمیری: مقدمہ: مولانا محمد یوسف بنوری، ص ۱۴، کراچی

مگر ساری کرو فر اس وقت ختم ہوگئی جب حضرت شاہ صاحب نے اپنے معصومانہ انداز میں سفید مونچھوں اور ڈاڑھی کے درمیان عنابی ہونٹوں کو جنبش دیتے ہوئے فرمایا: عالمِ مثال کے متعلق ابن سینا نے یہ کہا، غزالی کا نظریہ یہ ہے، ابن عربی یہ کہتے ہیں، رازی کا خیال یہ ہے اور میں یہ کہتا ہوں[۱]"

علامہ مصطفیٰ صبری اور ڈاکٹر اقبال کا اعتراف | جوہر کی قدر جوہری ہی سمجھ سکتا ہے جس طرح علامہ کشمیری کی فقہی بصیرت اور تخصصِ علم حدیث کے آگے وقت کے سربرآوردہ فقہاء اور محدثین نے سرخم کیا اسی طرح عقلی علوم میں ان کی مہارتِ کاملہ کا اعتراف وقت کے مسلم الثبوت علمائے معقولات نے بھی کیا ہے جس میں سرفہرست علامہ مصطفیٰ صبری (سابق شیخ الاسلام ترکی) اور ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے اسمائے گرامی ہیں۔

علامہ صبری کے بارے میں علامہ محمد یوسف صاحب بنوری محدثؒ لکھتے ہیں کہ جب میں نے علامہ کشمیری کا رسالہ "مرقاۃ الطارم علی حدوث العالم" انھیں پیش کیا تو اس کا مطالعہ کر کے انھوں نے کہا کہ میں اس چند اوراق پر مشتمل رسالے کو صدر شیرازی کی بسیط و ضخیم تصنیف "اسفار اربعہ" پر ترجیح دیتا ہوں[۲] کاتب الحروف کو علامہ صبری کے اس رسالے سے متاثر ہونے کا عملی ثبوت اس وقت ملا جب علامہ صبری کی چار ضخیم جلدوں پر مشتمل کتاب میں علامہ کشمیری کے اس رسالے کے کئی جگہوں پر حوالے پائے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

بعد ما ان کتبت هذا رأیت "مرقاة الطارم" لعالم الهند الکبیر

۱؎ حیاتِ انور: حصہ دوم: ص ۳۴۳۔

۲؎ حیاتِ انور۔

محمد انور شاہ الکشمیری ص ۳۷ " والمحوج الیٰ العلۃ لیس هو الامکان کالذی یکون فی ممکن بقی فی العدم ولا حدوث فی اوّل آن، بل وجود یکون من الغیر، فالعلّۃ هی الموجدیۃ الحادثۃ وکان المراد بالحدوث الوجود فی مقابلۃ العدم .... " فسرّنی ان اتفقنا فی الرای[1]

یعنی اثنا ریں جب کہ میں اس موضوع (حدوث وقدم عالم) پر کچھ لکھ رہا تھا کہ میں نے ہندوستان کے ایک بڑے عالم محمد انور شاہ الکشمیری کا رسالہ مرقاۃ الطارم ملاحظہ کیا ۔ وہ اس رسالے میں صفحہ ۳۷ پر لکھتے ہیں ..... میں خوش ہوا کہ ہم اس رائے میں متفق ہیں ۔

ڈاکٹر اقبال اور علامہ کشمیری | جہاں تک ڈاکٹر محمد اقبال اور علامہ کشمیری کے باہمی تعلقات کا تعلق ہے تو یہ ایک مستقل موضوعِ تحقیق ہے ۔ اگرچہ اس پر کچھ لکھا بھی گیا ہے مگر ابھی تشنگی باقی ہے اور پھر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں بہت کچھ بے اصل ہے ۔ وقت کے اِن دو نامور فضلاء نے ایک دوسرے سے کون سے فوائد حاصل کئے اس کے لیے پہلے دونوں کی تصانیف کا بغائر مطالعہ کرنا ضروری ہے ۔ علامہ اقبال کے معتقدین کی اس جماعت نے بھی آنے والے محققین کو سخت مشکلات میں ڈال دیا جو جماعت اقبال کی عقیدتمند بن کر ان کے فکر و فلسفہ کو مشق ستم بنائے ہوئے ہے ۔ انھوں نے اپنے من پسند افکار کو تقویت پہنچانے کی غرض سے نہ صرف اقبال کے افکار و خیالات کی تنسیخ و تحریف کی بلکہ مسلمہ تاریخی حقائق سے بھی آنکھ چرانے کی کوشش کی ۔ ایسے لوگوں کی کتابیں نہایت احتیاط سے پڑھنے کی مستحق ہیں اور وقت بھی آہستہ آہستہ ان کی تحریفی کوششوں کو مسترد کر رہا ہے بلکہ کر بھی چکا ہے ۔

علامہ محمد انور شاہ اور ڈاکٹر محمد اقبال کو آپس میں قریبی تعلق تھا، اور ڈاکٹر صاحب عملی طور

---

[1] موقف العقل والعلم والعالم من رب العالمین وعباده المرسلین، ج ۳ ص ۳۲۷ ۔

علامہ کشمیری سے مستفید ہوا کرتے تھے۔

ولم یزل یستفید فعلاً من العلّامۃ الکبیر انور شاہ الکشمیری والاستاذ الکبیر العلّامۃ السید سلیمان الندوی[1]	وہ علامہ محمد انور شاہ کشمیری اور علامہ سید سلیمان ندوی سے عملاً استفادہ کیا کرتے تھے۔

علامہ اقبال کے قریبی ساتھی اور مخلص دوست نیز ان کی تصانیف کے مشہور روزگار شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں :

"اقبال نے اپنے کلام میں ملّائیت کی ضرور تردید کی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ملّاؤں سے ناراض تھے۔ ملا اور ملائیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اقبال ملّائیت سے بے شک بیزار تھے لیکن ملا یعنی عالم دین کے عاشق زار تھے۔ چنانچہ آخری دور میں انھوں نے بڑی کوشش کی کہ ہندوستان کا سب سے بڑا ملا یعنے امام العصر علامۃ الدہر حضرت مولانا مولوی انور شاہ صاحب مرحوم و مغفور کسی طرح لاہور میں مستقل طور سے اقامت گزیں ہو جائیں تاکہ وہ ان سے استفادہ کریں[2]"

یہی حقیقت ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور حلقۂ اقبال سے منسلک دوسرے اعتدال پسند اور غیر متعصب اہل قلم نے بھی بیان کی ہے[3]

---

[1] روائع اقبال: مولانا سید ابوالحسن علی الندوی: ص ۱۲ (حاشیہ)، دار الفکر العربی، دمشق سنہ ۱۹۶۰ء

[2] ارمغان حجاز: شرح: پروفیسر یوسف سلیم چشتی: ص ۱۷۱-۱۷۲، دہلی۔

[3] علامہ اقبال کی مشہور نظم "ملّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری" جو ارمغانِ حجاز کے اردو حصے میں شامل ہے" کے بارے میں بعض اہل علم دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کا براہِ راست تعلق علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ ہی کے ساتھ ہے۔ اگرچہ نظم میں "انور شاہ" کا نام کسی جگہ نہیں آتا ہے مگر نظم کا عنوان پھر بھی اس قدر واضح ہے کہ اس سے علامہ کشمیری کے بغیر کوئی اور ذات مراد نہیں لی جا سکتی ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جہاں تک علامہ کشمیری رح کے حلقے کا تعلق ہے تو اس سے بھی ان دو شخصیتوں کے باہمی علمی رشتوں کی تائید و توثیق ہوتی ہے۔ جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب، جو گویا علامہ کشمیری کے صاحب البیت رہ چکے ہیں، انھوں نے بھی اپنے ایک مبسوط مضمون میں لکھا ہے:

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵) وادیٔ لولاب میں حضرت شاہ صاحب کے مرتبے کا کوئی اور عالم پیدا نہیں ہوا ہے۔ "ضیغم لولاب" کہلانے کے مستحق صرف حضرت مولانا انور شاہ رح ہی ہیں۔ جو یقیناً ملا زادہ ہی تھے۔ اقبال رح کے دل میں ملا کی جو قدر و منزلت تھی پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے وہ اچھی طرح واضح کی ہے۔ مزید برآں نظم کا یہ آخری بند بھی علامہ کشمیری ہی کی شخصیت پر روشنی ڈالتا ہے۔

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے   اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

اے وادیٔ لولاب

علامہ اقبال کی کئی نظمیں علمی اور ادبی نیز سیاسی و روحانی دنیا کی بعض سربرآوردہ شخصیتوں کی یاد میں لکھی گئی ہیں۔ مگر اگر ان کے عنوان پر تھوڑی دیر کے لیے انگلی رکھی جائے گی تو ان کی حقیقت تک پہنچنے میں بڑی دقت پیش آئے گی جیسے مسولینی، حکیم نطشہ، شیکسپیئر، بلال وغیرہ۔ جہاں تک زیر بحث نظم کے بارے میں شارحینِ اقبال کا تعلق ہے تو ان میں سے بعض حضرات نے سکوت اختیار کیا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالسلام ندوی انہی میں شامل ہیں۔ (ملاحظہ ہو شرح ارمغانِ حجاز، از مولانا مہر و اقبال کامل، از مولانا ندوی) پروفیسر چشتی کو بھی انہی میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ البتہ انھوں نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

"میری رائے میں لولاب کے لیے یہی فخر کافی ہے کہ شاہ صاحب یعنی امام العصر رأس المحدثین حضرت مولانا علامہ محمد انور شاہ صاحب مرحوم جیسا یگانۂ روزگار وہاں پیدا ہوا تھا۔ ہر چند مرحوم ہر فن میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے لیکن حدیث اور فقہ میں بلاشبہ تمام دنیائے اسلام میں کوئی شخص ان کا ہمسر نہ

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶) تھا یاؔ

بعض حضرات کے نزدیک اس نظم سے تو اہلِ کشمیر ہی مراد ہیں جن میں علامہ محمد انور شاہ صاحب بھی نہ صرف شامل ہیں بلکہ ان کے نزدیک نظم لکھتے وقت اقبال کے ذہن میں شاہ صاحب کا موجود ہونا بعید از عقل نہیں ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد انہی میں شامل ہیں۔ بعض اہلِ قلم نے اس نظم کو عجیب چکر دے کر دعویٰ کیا ہے کہ یہ نظم اقبال کی اپنی بیاض ہے۔ کوئی دوسری شخصیت اس سے مراد نہیں ہے، اس گروہ کے سرخیل پروفیسر خلیفہ عبدالکریم مرحوم ہیں (ملاحظہ ہو: فکرِ اقبال) مگر حق بات یہ ہے کہ خلیفہ صاحب اور ان کے پیروکار، اپنے علم و فضل کے باوجود، اس قابل نہیں ہیں کہ ایسی تاریخی باتوں میں ان پر کلی اعتماد کیا جائے، انھوں نے نہ صرف بہت سے حقائق مسخ کیے ہیں بلکہ اقبال کے فکر و فلسفہ کے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا ہے۔ چنانچہ بہت سے ماہرین اقبالیات نے اس کے خلاف آواز بھی اٹھائی جن میں آغا شورش کشمیری مرحوم بھی شامل ہیں۔ فکرِ اقبال کے علاوہ جنھوں نے خلیفہ صاحب مرحوم کا ایک اور کتابچہ "اقبال اور ملّا" ملاحظہ کیا ہو وہ بھی ہماری رائے کی تائید کرے گا۔ ان کتابوں میں تحقیقی خلش کے بجائے سیاسی تپش نظر آتی ہے۔ مشہور ماہر تعلیمات خواجہ غلام السیدین صاحب مرحوم نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی افتادِ طبع کے بارے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے، اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تحریروں کا افراط و تفریط سے محفوظ رہنا ناممکن تھا۔ (ملاحظہ ہو: مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں: ص ۱۶۷)۔ پھر یہ بات بھی صاف اور کھلی ہوئی ہے کہ علامہ اقبال کے اردگرد بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اقبال اور علمائے دیوبند میں مضبوط تعلق قائم نہیں کرنے دیتے تھے۔ ان لوگوں میں "بیرسٹر ... حضرات ہی نہیں بلکہ حید علماءِ ندوہ بھی داخل تھے۔

لہ ارمغان حجاز یا شرح: ص ۱۷۱-۱۷۲، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، اردو بازار دہلی ۱۹۷۶ء

• علامہ اقبالؒ کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات وشبہات سے پُر آتے تھے اور حضرتؒ ان کے شافی جوابات لکھتے۔" (حیاتِ انور: ص ۲۵۱)

اسی طرح پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی نے اپنے ایک مضمون زیر عنوان "اے کہ تو مجموعۂ خوبی" میں علامہ کشمیری اور ڈاکٹر اقبال کے تعلقات پر کچھ واقعات ومشاہدات درج کیے ہیں۔ مزید برآں مولانا اکبر آبادی نے راقم کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے علامہ کشمیریؒ کے نام وقتاً فوقتاً اتنے خطوط بھیجے تھے کہ اگر وہ آج محفوظ ہوتے تو جس طرح علامہ اقبال اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی باہمی مراسلت مستقل کتابی صورت میں وجود میں آئی اسی طرح علامہ اقبال اور علامہ کشمیری کی خط وکتابت ایک اچھی ضخامت کی کتابی شکل میں وجود میں آسکتی مگر علامہ کشمیری کی یہ عادت تھی کہ وہ خطوط پڑھ کر انھیں چاک کر دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں اس طرح کا ایک خط بھی نہیں ملتا ہے۔

غرض علامہ اقبال اور علامہ کشمیری کا علمی تعلق ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اقبال کے بعض مکتوبات اور خطبات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بلکہ اگر ہم کہیں کہ علامہ اقبال کی مذہبی شخصیت اور دینی ذہن کی اصلاح وتعمیر میں علامہ انور شاہ کشمیری کا ہاتھ بھی تھا، بلکہ سب سے بڑھ کر تھا، تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اگر ہم علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف ادوار کا مطالعہ کریں گے تو ہمیں ان کی ابتدائی اور آخری زندگی میں نمایاں فرق دکھائی دے گا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلب وذہن کے پیچھے کسی مردِ مومن کا اصلاحی ہاتھ کام کر رہا تھا۔

عارف عراقی ۹ | علامہ انور شاہ کے تلامذہ کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے اسلامی فلسفہ میں زمان ومکان کی حقیقت وحیثیت سمجھنے کے لیے علامہ انور شاہ کشمیری کی طرف رجوع کیا تھا۔ اس پر علامہ انور شاہؒ نے ڈاکٹر صاحب کے نام بہت سے خطوط بھیجے

بلکہ علامہ کشمیری نے عراقی کا ایک رسالہ انھیں ارسال کیا تھا۔ یہ رسالہ زمان و مکان کی حقیقت ہی سے بحث کرتا ہے اور اقبال اس سے متاثر بھی ہوئے تھے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ علامہ اقبال کے مشہور زمان انگریزی خطبات میں علامہ کشمیری کا کہیں بھی نام نظر نہیں آتا ہے مگر عراقی نام کے ایک صوفی کا کئی مقامات پر نام مذکور ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال مسئلہ زمان و مکان کی تحقیق میں عارف عراقی کی تحقیقات سے متاثر ہیں دوسری طرف علامہ کشمیری کے دو رسائل "ضرب الخاتم علی حدوث العالم" اور "مرقاۃ الطارم لحدوث العالم" میں عراقی کا حوالہ ملتا ہے۔ اس طرح ماخذ کی یکسانیت سے مذکورہ بالا روایت کی مزید تائید ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

اوّل، یہ کہ کیا اقبال کا عراقی وہی ہے جس کا علامہ کشمیری کے رسالوں میں حوالہ ملتا ہے۔؟

دوم، یہ عراقی کون ہیں۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اگرچہ اقبالؔ کے شارحین نے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے مگر خوش قسمتی سے علامہ اقبالؒ ایک خط میں اعتراف کرتے ہیں کہ عراقی کا رسالہ انھیں علامہ کشمیری نے عنایت فرمایا ہے۔ وہ مولانا سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رح کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ شیخ اکبر نے زمان و مکان کے مسئلے سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور متکلمین اسلام کی جن آراء سے اختلاف کیا ہے اس کا خلاصہ انھیں بھیج دیں، کیونکہ بقول ڈاکٹر اقبال انھیں یورپ جاکر شیخ اکبر پر لیکچر دینا تھا۔ آگے اسی مکتوب میں ڈاکٹر صاحب یہ الفاظ بھی لکھتے ہیں:

"حضرات صوفیاء میں سے اگر کسی اور بزرگ نے بھی حقیقت زمان پر بحث کی ہے تو ان بزرگ کے ارشادات بھی مطلوب ہیں۔ مولوی سید انور شاہ صاحب

مغفور نے مجھے عراقی کا ایک رسالہ مرحمت فرمایا تھا اس کا نام تھا فی درایۃ الزمان، جناب کو ضرور اس کا علم ہوگا، میں نے رسالہ دیکھا ہے۔ مگر چونکہ یہ رسالہ بہت مختصر ہے اس واسطے مزید روشنی کی ضرورت ہے[1]"
اس سے زیادہ تفصیل علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک لیکچر میں بھی فرمائی۔ ۱۹۲۸ء میں انھیں اورنٹل کانفرنس لاہور کے شعبۂ عربی و فارسی کے صدارتی فرائض سونپے گئے۔ اپنے فاضلانہ خطبۂ صدارت میں انھوں نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا:-

"جدید ریاضیات کے اہم ترین تصوّرات میں سے ایک تصور کا یہ مختصر حوالہ بالا میرے ذہن کو عراقی کی تصنیف "غایۃ الامکان فی درایۃ المکان" کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ مشہور حدیث لا تسبوا الدھر لان اللّٰہ ھو اللّٰہ میں دھر بمعنی ٹائم time کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق مولانا انور شاہ صاحب سے، جو دنیائے اسلام کے جیّد ترین محدّثین وقت میں ہیں ان سے میری خط و کتابت ہوئی۔ اس مراسلت کے دوران میں مولانا موصوف نے

---

[1] اقبال نامہ: مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ اول ص ۴۴۳-۴۴۴۔ اس خط میں علامہ اقبالؒ مولانا مہر علی شاہ کو یہ بھی لکھتے ہیں:
"اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی اور دروازہ نہیں جو پیش نظر مقصد کے لیے کھٹکھٹایا جائے"
مگر اسی مضمون کا ایک اور خط علامہ سید سلیمان ندویؒ کو بھی بھیج دیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس خط کی تاریخ بھی وہی ہے جو مہر علی شاہ صاحب کے مکتوب پر درج ہے: اقبال نامہ ص ۱۶۴-۱۶۵۔ علامہ ندوی نے انھیں اس موضوع پر دو رسالے بھیجے تھے ایک مولانا برکات احمد ٹونکی کا اتقان فی ماھیۃ الزمان اور دوسرا مولانا نور الاسلام کا "تحقیق المکان" مگر یہ دونوں رسالے علامہ اقبال کے لیے غیر تسلی بخش ثابت ہوئے تھے۔

مجھے اس مخطوطے کی طرف رجوع کرایا اور بعد ازاں میری درخواست پر مجھے اس کی نقل ارسال کی ہے[1]

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے تو یہاں عراقی کی تعیین میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ کیونکہ علامہ کشمیری اور ڈاکٹر اقبال ہر دو فضلا اپنی تصانیف میں عراقی نام لینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں، علامہ کشمیری "کما قال العارف العراقی" فرماتے ہیں[2] جب کہ

---

[1] علامہ اقبال کا یہ خطبہ انگریزی زبان میں زیر عنوان A Phea for Deeper Study of the Muslim Scientists ۔ اسے بعد میں جناب اسرائیل احمد خان صاحب (بی۔ اے۔ جامعہ) نے اردو میں منتقل کر کے رسالہ "صوفی" منڈی بہاء الدین پنجاب بابت مارچ ۱۹۳۱ء میں شائع کیا۔ اب یہ علمی مضمون نایاب ہو گیا تھا اور حال ہی میں اسے جناب عبدالغفار صاحب شکیل نے "اقبال کے نثری افکار" مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی میں دوبارہ شائع کر لیا۔ اردو میں اس کا عنوان "حکمائے اسلام کے عمیق تر مطالعے کی دعوت" ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ علامہ اقبالؒ اس حدیث مبارک سے مسحور کی حد تک متاثر تھے۔ ان کے منظوم کلام میں بھی اس حدیث پاک کی طرف اشارے ملتے ہیں، اور وہ یورپ کے سربرآوردہ فلاسفر کو بھی یہ حدیث پاک سناتے تھے۔ پروفیسر مسعود حسین خان صاحب اپنے ایک قابلِ قدر مضمون "اقبال کی دو طویل نظموں کی بازآفرینی" میں لکھتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ اقبال نے برگساں "Bergson" کو جب لاتسبوا اللہ کی حدیثِ شریف کا ترجمہ سنایا تو وہ اپنی پہیوں والی کرسی پر، جس پر وہ علالت کے باعث بیٹھا تھا اچھل پڑا اور پوچھنے لگا: یہ کس کا قول ہے؟"

اقبال: جامعہ کے مصنفوں کی نظر میں: مرتبہ گوپی چند نارنگ، مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۷۹ء: ص ۱۷۸۔

[2] مرقاۃ الطارم لحدوث العالم: علامہ محمد انور شاہ کشمیری: ص ۴ (حاشیہ) مطبوعہ ڈابھیل

ڈاکٹر محمد اقبال نمبر ۲۹۰۶ میں لکھتے ہیں، مولانا مہر علی صاحب کے نام علامہ اقبال کا جو مکتوب ملتا ہے اس میں رسالے کا نام فی درایۃ الزمان ہے جو ظاہر ہے عربی ذوق کے مطابق پورا نام نہیں ہے۔ البتہ محوّلہ بالا خطبۂ صدارت (لاہور) میں غایۃ الامکان فی درایۃ المکان درج ہے۔ ادھر علامہ کشمیری کے ایک مشہور شاگرد (مولانا محمد انوری لائلپوری) نے اپنے استاد اور ڈاکٹر اقبال کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے عراقی اور اس کے رسالے کا بھی ذکر کیا ہے۔ بقول ان کے رسالے کا نام غایۃ البیان فی تحقیق الزمان والمکان ہے[1] اس کے علاوہ علامہ محمد انور شاہ کے شہرۂ آفاق امالی فیض الباری علی صحیح البخاری میں بھی اس رسالے کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہاں اس کا نام التبیان فی حقیقۃ الزمان والمکان ملتا ہے اور صراحت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ یہ رسالہ شیخ فخر الدین عراقی نے لکھا ہے[2] فیض الباری میں یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ شیخ فخر الدین عراقی کا تذکرہ نفحات الانس میں موجود ہے[3] مگر مشکل یہ ہے کہ شیخ فخر الدین عراقی نے جو بلا شبہ اسلامی تصوف کی تاریخ میں ممتاز صوفی اور شاعر گزرے ہیں اس نام کا کوئی رسالہ نہیں لکھا ہے۔ نفحات الانس میں شیخ فخر الدین ابراہیم المشتہر بالعراقی کا تذکرہ چار صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ان کی تصانیف میں صرف لمعات اور دیوان شعر کا ذکر ہے[4] مولانا شبیر احمد خاں غوری نے اپنے ایک مضمون میں اس رسالے کو میر سید علی ہمدانی کی تصانیف میں گنا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"سید علی ہمدانی کی تصانیف میں غایۃ المکان فی درایۃ الزمان

---

[1] انوار انوری؛ بحوالہ حیاتِ انور۔

[2] فیض الباری علی صحیح البخاری: علامہ محمد انور شاہ کشمیری: ج ۲ ص ۲۷۰۔ [3] ایضاً۔

[4] نفحات الانس من حضرات القدس: مولانا عبد الرحمٰن جامی کتاب فروشی سعدی طہران ص ۶۰۱۔

بھی ہے جس میں انھوں نے زمان اور مکان کا ایک نرالا تصور پیش کیا ہے۔
اس تصور کو علامہ اقبال نے الٰہیاتِ اسلامی کی تشکیل جدید میں عراقی کی طرف منسوب کیا ہے۔[۵]

مگر جہاں تک میر سید علی ہمدانی کی تصانیف کا تعلق ہے بلا شبہ ان کی ساری کتابیں آج موجود نہیں ہیں مگر ان کے تذکرہ نگاروں نے ان کی جن تصانیف کا نام محفوظ رکھا ہے جن کی تعداد چالیس سے تجاوز کرتی ہے ان میں اس نام کا کوئی رسالہ نہیں ملتا ہے۔ میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کا چرچا ہند اور ہمدان سے زیادہ کشمیر میں رہا ہے، مگر یہاں کے تذکرہ نگاروں نے بھی اس رسالے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ گزشتہ سطور کی روشنی میں رسالے کا صحیح نام غایۃ الامکان فی درایۃ الزمان والمکان نظر آتا ہے۔ ممکن ہے یہ وہی رسالہ ہو جس کا مصنف مشتبہ ہے اور عموماً شیخ تاج الدین بتلائے جاتے ہیں۔

ایران کے محقق محمد تقی دانش پژوہ نے شیخ روزبہان بقلی (جو شیخ نجم الدین کبریٰ رح کے شیخ طریقت تھے) کے معاصرین میں ابوالرضی صدر الدین محمد فیلسوف واعظ کو بھی گنا ہے۔ شیخ تاج الدین انہی امام ابو رضی کے والد بزرگوار تھے۔ امام ابو رضی بڑے فلسفی عالم تھے۔ اسی فلسفہ دانی کے جرم میں اتابک ابوبکر سعد بن زنگی (۶۲۳ھ — ۶۵۸ھ) نے انھیں شیراز سے بدر کیا تھا۔ ان کے والد شیخ تاج الدین بھی بلند مرتبہ عالم اور فلسفی تھے اور انھوں نے ہی غایۃ الامکان فی درایۃ الزّمان والمکان نام کا رسالہ لکھا ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۱۱ھ میں طہران سے شائع ہوا ہے۔ اس زمانے میں علامہ محمد انور شاہ دار العلوم میں زیر تعلیم تھے اور ۱۳۲۰ھ تک کشمیر سے باہر دیوبند اور دہلی میں حصولِ علم اور خدمتِ علم میں منہمک تھے، اور وہ دیگر علوم و فنون کے ساتھ معقولات کی کتابوں کا بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ

---

[۵] مجلّہ علوم الاسلامیہ: علی گڑھ؛ جون — دسمبر ۱۹۶۹ء: ص ۸۱۔

کرتے تھے اور نادر قلمی کتابوں کی نقلیں اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے۵ غرض یہی رسالہ علامہ انور شاہ کشمیری کے ہاتھ آیا تھا اور بعد میں علامہ اقبال سے تعلقات قائم ہونے پر انھیں اس کی نقل بھیج دی تھی۔

اگرچہ رسالہ شیخ تاج الدین ہی کے نام پر چھپ چکا ہے مگر بعض اہلِ علم اسے شیخ تاج الدین کے استاد ابو ثابت شمس الدین محمد بن عبدالملک دیلمی اور بعض محمود شبستری کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

---

۵ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی زمانے میں علامہ کشمیری کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک اور رسالہ حاصل کیا تھا جس کا تعلق "اسطرلاب" کے اعمال اور وظائف سے ہے۔ مولانا بنوری نے اپنی کتاب میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس سے بھی معقولات کی کتابوں کے ساتھ علامہ انور شاہ کی دلچسپی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دیکھیے

بغیۃ الأریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب: مولانا بنوری

طبع اوّل قاہرہ ۱۹۳۹ء : ص ۴۴

۵۲ روز بہان نامہ: انتشاراتِ انجمن آثار ملی ۱۳۴۷ھ: ص ۵۱ = اب جب کہ میں یہ سطور ختم کرنے کے قریب تھا کہ "نقوش" لاہور کے اقبال نمبر، ۱۹۷۷ء میں جناب مولانا امتیاز علی خان صاحب عرشی کا محققانہ مضمون "اقبال اور عراقی" نظر سے گزرا۔ مجھے مسرت ہوئی کہ خلاصۂ بحث میں ہم متفق ہیں۔ مولانا عرشی نے بعد میں اسی مضمون کے عنوان کو زیادہ مناسب بنا کر سہ ماہی رسالہ "اسلام اور عصر جدید" میں بھی شائع فرمایا۔ دیکھیے "تصورِ زمان و مکان کے متعلق اقبال کے ایک ماخذ کی تعیین"

بابت اکتوبر ۱۹۷۷ء